OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

قرآنی تصور رجاء کا اطلاقی مطالعہ

Applied Study of the *Qur'ānic* Concept of Hoop

Muhammad Abdul Basit
Doctoral Candidate Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat
Dr. Qazi Furqan Ahmed
Assistant Professor of Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat

Abstract

The Article lessons pragmatic study of the Qur'anic concept of Hoop. It discusses that thoughts and conducts which precise the state of hoop and they conceive the idea of nurturing faith in veins of mankind and this is causes the concept of divinity, and divinity to be refined in man, in solitude. The concept of obligation materializes when the love of Allah almighty prevails and acknowledges. Self-deception becomes a means of protection and self-accountability. The goals fulfill the *Shariah* and manifestations and effects of hoop and revealed the facts by which humanity in general and the Muslims in particular, by practicing, can achieve their worldly and otherworldly and eternal success and salvation.

Keywords: Quran, concept, hoop, pragmatic study

تمہید

قرآنی تصور امید (رجاء) ایک تعلیم وتربیت کا حامل اور عمومی نوعیت کا اطلاقی موضوع ہے جو عموماً ہماری نظروں سے او جھل رہتا ہے جس کی ضرورت اور اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اسلام اپنے متبعین کو ایک ایسے نظام حیات میں پروتا ہے کہ جس سے اس کے متبعین مکمل آشنائی وراہنمائی حاصل کریں اور انہیں دنیوی اور اخروی حیات کے بارے میں تمام تر اہم اور ضروری معلومات مکمل شخصی و عملی نمونہ کے ساتھ فطری اور شرعی ممکنات سے مل سکیں۔ نفس مطمئنہ کا حقیقی مصداق تو وہی ہو سکتا ہے جو اتباع واطاعت رسول ﷺ کے تناظر سے ہی شکوہ شکایت کو چھوڑ کر اجر اور ثواب کی لذت اور حلاوت محسوس کر سکے، قرآن کریم اپنے متبعین کے لیے مکمل رشد وہدایت کی قانونی شکل میں موجود ہے اور تمام معاملات کی حدود و قیود کو متعین کرتا ہے جن کی پابندی ہر مسلمان پر اپنی اخروی اور ابدی نجات کے ضمن میں ضروری ہے۔ انسان کا ازلی وابدی دشمن راہ ہدایت سے ہٹانے کے

CC BY

لئے اور اسے گہری کھائی میں دھکا دینے کے لئے اس میں مایوسی بھرتا ہے اور مایوسی پہلے ناامیدی اور نامرادی میں دھکیلتی ہے اور پھر اسے رفتہ رفتہ راہ حق سے دور کر دیتی ہے، مایوسی سے بچنے کے لئے قرآن کریم نے امید کا دیا روشن کیا ہے کہ جس کی لو میں انسان اندھیرے اور گھٹا ٹوپ وادیوں سے گزرتے ہوئے شیطان کے بہکاوے سے متنبہ ہو جائے کہ کہیں اس کی مادی ضروریات امید اور نیکی سے دور نہ کر دے، انسان کو وہ اسلوب حیات عطا کیا ہے جو اس کے جدت کردار کا متمنی ہے اور عمل پیہم سے ایک صبح روشن کی امید جگاتا ہے۔ تمام انسان کسی بھی مذہب وملت سے منسلک اور متبع ہوں ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک تصور امید پنہاں کیا ہے تاکہ اپنے اعمال کی سیاہی سے دل کے سیاہ ہونے بچا سکیں، امید ہو تو پھر مایوسی کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور اگر مایوسی دل میں گھر کر جائے تو پھر امید کس طرح جگائی جائے، حقیقت میں مایوسی سے پیچھا چھڑانے کے لئے قرآن کریم نے متعدد مظاہر اور آثار بیان کئے ہیں۔

امید (رجاء) کے معانی اور مفاہیم کا تحقیقی جائزہ

اردو زبان میں امید (رجاء) کے معانی اور مفاہیم

اردو لغت میں " امید" کا لفظ آس، آسرا، آرزو، خواہش، تمنا، توقع، اشتیاق، ارمان بھروسا، حمل پیٹ کے لئے استعمال ہوتا ہے[1]، آس، آشا، آسرا، ڈھارس، امل، رجاء، امید کے لئے مستعمل ہے اور اردو میں امید کے مترادفات چاہ، اشتیاق، تمنا، خواہش، آرزو، حمل گابھ، گربھ ہیں[2]، اسی طرح آس کے مترادفات میں بھروسہ، آسراء، تکیہ، اعتبار، سنگت ہیں[3]۔ فیروز اللغات میں امید کے لئے آرزو، توقع، آس اور حمل کا[4] معنی بتلایا گیا ہے[5] اور اس کے مترادفات میں خواہش، تمنا، چاہ، مراد، مقصد[6]، بھروسا، آس[7] ارمان، رغبت، مرضی، مدعا، مراد، مطلب، شوق،[8] بیان کئے گئے ہیں۔ محاورات ؛ آسرا باندھنا، آسرا رکھنا، توقع ہونا، بھروسا رکھنا بھی امید کے لئے ہیں[9]۔ امید بر آنا، امید رکھنا، امید کرنا، امید سے ہونا۔

عربی زبان میں امید (رجاء) کے معانی اور مفاہیم

امید کے لئے عربی زبان وادب میں لفظ رجاء استعمال ہوتا ہے ہمارے معاشرہ میں لفظ امید ہی عربی لفظ رجاء کے لئے بولا جاتا ہے الرجاء عربی زبان میں امید کو کہتے ہیں، مایوسی اسکی نقیض ہے، رجاه يرجوه رجوا ورجاوة ومرجاةورجاة، رجاء میں ہمزہ اصلی نہیں کیونکہ مضارع میں واؤ سے تبدیل ہو جاتا ہے اور مصدر میں رجاء الف کو قبول کرتا ہے بھاری پن نہ ہو اور آسانی پیدا ہو سکے۔ "الرجاء في معنى الخوف لا يكون الا مع الجحد" [10] رجاء بمعنی خوف کہتے ہیں جب اس میں کسی ممانعت کا ذکر ہو امام راغب اصفہانی کہتے ہیں: "اصل الرجاء الجانب من کل شیء"[11] (رجا کی اصلیت ہر چیز کا پہلو ہے) اس کی جمع "ارجاء" اور تثنیہ "رجوان" ہے، اور اس اونٹنی کو بھی کہتے ہیں جو بچہ جننے کے قریب ہوتی ہے۔ "الارجوان" خوشنما سرخ رنگ ہوتا ہے جو امید کی خوشی دیتا ہے[12]۔ "الرجاء" ناامیدی کی نقیض ہے، رجا کنارہ یا کنویں کے کنارہ کو کہتے ہیں، "الارجا" تاخیر کے معنی میں ہے اور اسی سے " مرجیئه" ہے۔ "ارجا" ہمزہ کو ترک کر دیں تو اس کا معنی موخر کرنا ہے جیسے " وآخرون مرجئون (یعنی موخرون) لامر اللہ"[13]، اس سے مراد ہے کہ جو وہ چاہتے ہیں وہی اس کی بابت نازل ہو۔ "رجا" اگر مقصور ہو تو اس کا معنی کنارہ ہے یا کنویں کا کنارہ اوپر سے نیچے تک[14]۔

امید (رجاء) تعریفات

رجاء اس ظن غالب کو کہا جاتا ہے جس میں خیر کی توقع کی جاتی ہے، علم اور مشاہدہ نہیں ہوتا، رجاء جو نیکی کے ہونے اور برائی کا ڈر اور خوف بھی ہے حالانکہ ڈرنے والے اور امید رکھنے والے کو اس شک بھی ہوتا ہے، اس میں امید رکھنے والے کو امید کا سبب امید دلاتا ہے[15]۔ ابن قیم نے رجاء کی تعریف یوں کی ہے: "الاستبشار بجود وفضل الرب تبارك وتعالى والارتياح

لمطالعه كرمه"(اس خوشی کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جود و فضل اور لطف اے حاصل ہونے والے اطمینان کو کہتے ہیں)"وقيل هو الثقة بجود الرب تعالیٰ"(اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا پر اعتماد رجاء ہے)"الرجاء هو النظر الى سعة رحمة الله"[16](اللہ کی رحمت کی وسعت کی طرف نظر رجاء ہے)شریف الجرجانی اس کی تعریف یوں کرتے ہیں :"تعلق القلب بحصول محبوب في المستقبل [17]"(دل کے اس تعلق کو کہتے ہیں جو مستقبل میں کسی پسندیدہ چیز کا حصول ہے)امام غزالی اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :"حالة ايمانية يرتاح القلب فيه الانتظار ما هو محبوب عنده"[18](ایسی حالت ایمانی جو دل کو راحت دیتی اور جس میں ایسی چیز کا انتظار ہوتا ہے جو اللہ کو پسند ہوتی ہے)"الرجاء هو الظن بوقوع الخير الذى يعترى صاحبه الشك فيه الا ان ظنه فيه اغلب وليس هو من قبيل العلم وهو الامل في الخير "[19](حسن ظن کے وقوع ہونے کو کہتے ہیں جس میں شک تو ہوتا ہے لیکن شک کرنے والے کو ظن غالب ہی ہوتا ہے اور وہ علم کی طرح حتمی نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی امید دلاتا ہے)

(امید) آیات الرجاء

قرآن کریم میں 28 مقامات پر رجاء کے مشتقات کو بیان کیا ہے، 19 آیات مکی سورتوں میں ہیں اور 7 آیات مدنی سورتوں میں ہیں، ذیل میں ان الفاظ کی تفصیل تعداد کے اعتبار سے ذکر کی جاتی ہے؛ "ترجوا"(ایک دفعہ)"ترجون "(دو دفعہ) "ترجوها"(ایک دفعہ)" يرجوا"(پانچ دفعہ)" يرجون"(12 دفعہ)"ارجو"(ایک دفعہ)"ترجی"(ایک دفعہ)"ارجه"(دو دفعہ)"مرجوا"(ایک دفعہ)"مرجون"(ایک دفعہ)" ارجائها"(ایک دفعہ)[20]۔

مظاہر الرجاء (امید)

مظاہر، ظہر سے ہے جس کا معنی کسی چیز کا کھلنا اور ابھرنا"ظهر الشيء بالفتح ظهورا برد الشيء الخفی"[21](مظاہر مظہر کی جمع ہے، کسی چیز کو سامنے لانا، ظاہر چیزیں یا نظارے، ظاہر ہونے کی جگہ، مشاہدات کو کہتے ہیں)اس سے مراد وہ رجحانات ہیں جو کسی فرد کو فطری طور پر ایسا رجحان مرتب کرنے میں مدد دیتا ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو ذاتی اعتبار سے اور اجتماعی اعتبار سے ایک متاثر کن بنا سکے تو ایسے امور کو مظاہر کہہ سکتے ہیں۔ (امید) رجاء محمود کا لازمی عنصر یہ ہے کہ امید رکھنے والے پر اس کی ظاہری اثرات ایسے دلالت کریں کہ رجاء محمود متحقق نظر آتی ہو، ہر امید عمل سے بالجزم تبھی ممکن ہوتی ہے جب اس کے مظاہر عملاً ابدی تناظر میں ہوں تا کہ اس کی امید جس پر تکیہ کئے ہوئے ہے وہ اس کے لئے ایک ابدی ذریعہ اور اسلوب بن سکے ۔ مظاہر سے مراد وہ ساری کیفیات ہیں جن کو ایک انسان اپنی ذاتی زندگی میں عموماً اور اجتماعی میں خصوصاً اپنا کر معاشرہ کا مفید فرد بن سکتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین قیاس ہے کہ مطلوب مؤمن کی وہ تمام خوبیاں جن کو قرآن کریم نے سورہ فرقان میں عباد الرحمٰن سے منسوب کیا ہے۔[22]

اسوہ رسول ﷺ

مظاہر الرجاء (امید) میں سب سے اولین اور اساسی مظہر اسوہ رسول ﷺ ہے، امید کی بار آوری کے لئے بالعموم اور فرد کی تربیت اور اصلاح کے لئے بالخصوص جو چیز سب سے اہم اور مؤثر ہے وہ شخصی نمونہ ہے کیونکہ شخصیت کا انداز اور عمل وہ پہلو ہیں جو نمایاں طور پر اہمیت رکھتے ہیں اسی بنا پر خالق کائنات نے نبی کریم ﷺ کو انسانیت کے لئے کامل نمونہ اور اسوہ حسنہ کا پیکر بنا کر مبعوث کیا ہے قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا"[23](حقیقت یہ کہ تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو) نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ قرآن کریم

کا عملی نمونہ اور مثالی پیکر ہے جس طرح کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک قوت ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کی ذات بابرکات بھی کائنات میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا عظیم شاہکار ہیں، کائنات کی تمام قوتیں مجتمع ہیں اور کائنات کی ناموس آپ ﷺ ہی کے دم قدم سے مکمل ہوتی ہے نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ اور سنت مطہرہ ایک زندہ حقیقت ہے اور رہے گی اور جب تک نظام کائنات قائم رہے گا سیرت طیبہ انسانی نفوس کو متاثر کرتی رہے گی ان کی روح کو جلا بخشے گی، دل و دماغ کو منور کرے گی، دور نبوت میں جن حضرات نے ذات اطہر سے براہ راست تعلیم و ہدایت حاصل کی ان کے قلوب منور ہو گئے اور انہیں اس نور سے اس قدر عظیم قوت حاصل ہوئی کہ قلیل تعداد ہونے کے باوجود انہوں نے تاریخ انسانیت کے سب سے حیرت انگیز اور سب سے عظیم کارنامے سر انجام دئے اور آج بھی جو شخص اشتیاق و محبت کے جذبات کا امیدوار بن کر اسوہ حسنہ کا مطالعہ کرے گا اس کو ذات نبوت سے نور اور قوت حاصل ہو سکتی ہے، نبی کریم ﷺ کی شخصی تاثیر سے جو افراد تیار ہوئے وہ تاریخ انسانیت کے مثالی کردار بن گئے اور آج تک روشنی کا ذریعہ ہیں قرآن کریم ان افراد صالحہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُوْلَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّه"[24] (جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں وہ بیشک ساری مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ ان کے پروردگار کے پاس ان کا انعام دوسدا بہار جنتیں ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں۔ وہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش ہو گا اور وہ اس سے خوش ہوں گے یہ سب کچھ اس کے لئے ہے جو اپنے پروردگار کا خوف دل میں رکھتا ہو) سورہ فرقان میں ان تربیت یافتہ افراد کا سراپا اس طرح بیان ہو کہ رہتی دنیا تک کے لئے مثالی افراد جاننے کا ذریعہ ہیں کہ جن کے سپرد دعوت کی گئی تھی کیونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد کسی اور نبی نے آنا نہیں اس لئے آئندہ نسلوں کے لئے تربیت اور خدمت خلق کے ابدی اصول بیان ہوئے اور اسوہ حسنہ کو تربیت کا مستقل اور پائیدار ذریعہ قرار دیا، نبی کریم ﷺ نے اپنی وابستگی اور محبت کو اہل ایمان کے لئے لازمی قرار دیا:"لایومن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین"[25] (کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں) سوہ حسنہ انسانی زندگی کا ایک زندہ جاوید معیار ہے جس کو سامنے رکھ کر فرد انفرادی اور جماعت اپنی اجتماعی زندگی کو معیاری بنا سکتے ہیں، خود احتسابی کے لئے جو نمونہ عمل وہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات، قول و فعل اور کردار وارشاد کو ایسے معیارات پر قائم کیا کہ ہر فرد ہر لحہ اپنی تکمیل کے لئے متوجہ رہے اور اس طریق سے صالحیت کی ایسی پرواز ہو کہ ہر فرد اجتماعیت کے لئے رحمت بن جائے۔[26]

اطاعت اور اتباع میں فرق

اطاعت باب افعال مصدر ہے اور اس باب کا خاصہ سلب کرنا بھی ہے جس سے یہ معنی اخذ ہوتے ہیں کہ اپنی پسند اور خوشی کا سلب کر لینا اس پسند اور خوشی کے مقابل جس کی اطاعت کی جائے، یہ بھی حقیقت ہے کہ کہ اطاعت بغیر محبت کے نہیں ہو سکتی اور قانون کبھی خوشدلی سے قبول نہیں کیا جاتا جب تک قانون بنانے والے سے محبت نہ ہو، اطاعت تبھی پسند ہو سکتی جب مطاع بھی پسند ہو جائے۔ اتباع اور اطاعت عمومی طور قریب المعنی سمجھے جاتے ہیں لیکن ان میں تکنیکی فرق معلوم ہو تا ہے، اطاعت میں مطاع کی عظمت پیش نظر ہوتی ہے اور اتباع میں متبع کی محبت، عقیدت کا جذبہ غالب اور نمایاں ہو تا ہے، اطاعت میں حلال و حرام، فرائض و واجبات پر مشتمل ہے جبکہ اتباع میں عمومیت پائی جاتی ہے اور اس میں مستحبات بھی ہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فکری ہم آہنگی کو اطاعت کہتے ہیں اور عملی اقدام کو اتباع کہتے ہیں۔ اطاعت واتباع رسول ﷺ کا داعیہ تو محبت اور تکریم کے نتیجے میں از خود پیدا ہو تا ہے کیونکہ یہی داعیہ امید کے چراغ روشن کرتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت واتباع اہل عقل

کے نزدیک مسلمہ ہے اور اطاعت واتباع بلامحبت محض قانونی ہوتی ہے حقیقی نہیں اصل بنیاد جو ایک مؤمن کے ایمان کی علامت اور پہچان ہے وہ نبی کریم ﷺ کی اطاعت واتباع ہے جو حب النبی ﷺ سے ملفوف ہے۔ ملا علی قاری مشہور حنفی عالم بیان کرتے ہیں"علامة حب النبی ﷺ حب السنة وعلامة السنة حب الآخرة وعلامة حب الآخرة بغض الدنيا وعلامة بغض الدنيا ان لا ياخذ منها الا زاد يبلغه العقبیٰ "[27](حب رسول ﷺ کی پہچان سنت سے محبت ہے اور سنت سے محبت کی پہچان آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی پہچان دنیا سے بغض اور دنیا سے بغض کی پہچان یہ ہے کہ دنیا سے فقط اتنا ہی لے تاکہ آخرت تک پہنچنے کی ضرورتیں پوری ہوسکیں)اس لئے ایک مومن کو"سمعنا و اطعنا"کا مکمل مظہر بن جانا ہوگا اور اس میں اس قدر استغراق ہو کہ کوئی بھی ایسا فعل ظہور نہ ہو جو منافی اطاعت واتباع ہو کیونکہ اس کا مقصود صرف محبت رسول ﷺ ہے، اطاعت واتباع تو اصل میں اپنے آپ کو سپرد کردینے کا نام ہے جس سے انسان جب مستفید ہوتا تو"نفس مطمئنه"[28] کے درجہ سے نوازا جاتا ہے اور حقیقی اور یقین امید کا استعارہ اور بشارت کا مصداق بنتا ہے اور ایسی شدید اور کامل اطاعت واتباع پروان چڑھتی ہے کہ کفر، معصیت سے دوری شریعت کا حکم تو ہے ہی لیکن یہ دوری اس کی طبیعت کا خاصہ بن جاتی ہے یہی رشد وہدایت اسے اپنے رب سے امید ورجائیت پیدا کرتی ہے۔ اطاعت اور اتباع کے قانونی اور اعتقادی پہلو تو واضح اور ظاہر ہیں، ذات رسول ﷺ مومن مطلوب کی طبیعت میں ایسا استحضار پیدا کرتی ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کے لئے حجت اور دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ شفاعت کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں جو کی امید کا بڑا سہارا ہیں اہل دانش تصور سازی چاہے کتنی ہی کیوں نہ کرلیں اوراس میں انہماک ان کو بیگانہ ہی کیوں نہ کردے تو ان کے تصورات کو تسکین نہیں ہوسکتی کیونکہ شعور کی تسکین ناگزیر ہے اور یہ تسکین صرف اطاعت وتباع رسول ﷺ سے ہی ممکن ہے۔

صبر

صبر کا لفظ عام بولا جاتا ہے مقام کے اختلاف سے اس کے معنی میں انفرادیت پیدا ہوجاتی ہے اگر اپنے آپ کو روکنا مراد ہو تو اسے صبر کہتے ہیں اور اس کا متضاد جزع یعنی واویلا کرنا ہے اور اسی طرح اگر موقع جنگ کا ہو تو اس سے مراد بہادری ہے اور اس کا متضاد بزدلی ہے اور اگر کوئی ناگہانی آفت آجائے تو فراخ دلی کو کہتے ہیں اور اس کا متضاد بے چین ہونا ہے اور اگر گفتگو کو روک لیا جائے تو چھپانا اور اس کا متضاد ،راز کھولنا ہے اللہ تعالیٰ نے ان سب کو صبر کا نام دیا ہے۔[29] مصائب اور آلام کو دور کرنے اور پشیمانیوں پر شکوہ شکایت چھوڑ دینا صبر کہلاتا ہے اور شکایت کو حرف زبان نہ بنا امید جگاتا ہے اور اس کو ثواب کی لذت اور حلاوت محسوس ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بسا اوقات آزمائش ناراضگی کی وجہ سے مسلط نہیں کرتا بلکہ ناپسندیدہ امور اور عادات کو دور کرنے کے لئے اور بسا اوقت بعض ناپسندیدہ اعمال کے کفارہ کے طور پر بھی، کبھی انسان کے بلندی اخلاق اور اقبال کے لئے بھی انسان کو کچھ چیزیں سہنی پڑتی ہیں اور جب بندہ اپنے رب کی معرفت پالیتا ہے تو اپنی اس آزمائش کو بھی اپنے لئے امید کا دیا سمجھ کر اپنی زندگی کو روشن کرکے ثواب کماتا ہے۔ صبر سے انسان صدق وتصدیق اور نیکی سے مقام معصیت پر صبر کرنا اور اطاعت پر صبر کرنا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کی تعریف سوائے امتحان اور شدت کے وقت ہی فرمائی ہے، جیسے مومنوں میں نیک کم ہیں تو نیکوں میں سچے کم ہیں اور سچوں میں صبر کرنے والے کم ہوں گئے تو گویا سچائی کو صبر کی خاصیت قرار دی ہے۔ صبر کو دیکھا جائے تو چیزوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک یہ کہ جس کے بغیر دین کی اصلاح نہیں ہوسکتی اور دوسری وہ جو دین کے فساد کی جڑ ہے لہٰذا دین کی اصلاح یہ ہے کہ صبر کرئے تاکہ اس کے ایمان کی تکمیل ہو اور جس سے دین کا فساد ہے اس پر صبر کرئے تاکہ اس کا دین بہتر ہو اور ایمان ترقی کرے۔[30]، بعض نے اس شخص کو مؤمن شمار نہیں کیا جسے ایذا نہ دی جائے ایذا کو برداشت کرئے گا تو ایمان کی وجہ سے اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ بطور امتحان ان کے ساتھ ایسا رویہ کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ بطور عذاب ایسا نہیں ہے اللہ

تعالیٰ جس کی آزمائش اور امتحان چاہتا ہے تو اصل میں ان کے ساتھ بھلائی اور رحمت کا معاملہ ہی ہوتا ہے، لوگ آزمایش کو عذاب سمجھتے ہیں وہ تو ایک باطنی رحمت ہے [31]، اللہ تعالیٰ نے فقر کے ذریعہ اہانت نہیں کی جیسا کہ نعمت کے ذریعے دوسروں کا اکرام نہیں کیا[32]، گویا صبر انسانی طبیعت پر سب سے زیادہ دشوار اور گراں ہوتا ہے اور اس میں سب سے زیادہ مشکل، ذلالت، درد اور تکلیف کو برداشت کرنا ہوتا ہے اور اسی صبر سے تواضع ہے اور اسی صبر سے حسن اخلاق ہے اور اسی صبر سے مخلوق کو اذیت سے بچانا اور مخلوق سے اذیت کو برداشت کرنا ہے۔ وہ امور جن سے انسان اپنے آپ میں تنگی اور ناپسندیدگی پر آمادہ ہوتا ہے سب سے افضل حالت اسی لئے ہے کہ انسان وہی مطلوب ہے جو تنگی کے وقت صبر کا ثبوت دیتا ہے اور اس کی یہی وصف اس کے اعمال میں نیکیوں کا باعث بنتا ہے [33]، اور جو چیز صبر سے انسان کو نکالتی ہے وہ جزع فزع کرنا ہے اور حد سے تجاوز کثرت شکایت ہے، یہ وصف بشریت تو ہے اور طبیعت کے منافی بھی ہو سکتا ہے لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ حتی المقدور شکایت سے پہلو تہی ہی کرے اور اللہ کے حکم پر ناراضگی کا اظہار نہ کرے [34]۔ صبر دین کے ایک مقام اور سلوک کی ایک منزل کا نام ہے اور دین کے جتنے مقام ہیں ان تین چیزوں سے بنتے ہیں پہلے معارف، دوسرے احوال اور تیسرے اعمال، معارف سب کی بنیاد ہے اور ان کی وجہ سے احوال بنتے ہیں اور احوال سے اعمال ظاہر ہوتے ہیں ان کی مثال اس طرح سمجھنی چاہیے کہ معارف درخت کی مانند ہے اور احوال اس درخت کی شاخوں کی طرح ہیں اور اعمال اس پھل کی شبیہ سمجھنا چاہیے، اور یہ سالکین کی تمام منزلوں میں موجود ہے ایسا صبر جسے ہم کامل کہہ سکتے ہیں کہ پہلے معرفت حاصل ہو اور پھر اس کے بعد ایک حالت قائم ہو درحقیقت صبر ان دونوں کا نام ہے، صبر انسان کا خاصہ ہے فرشتوں اور جانوروں میں نہیں ہوتا، فرشتوں میں تو کمالیت کی وجہ سے اور جانوروں میں ان کے نقصان کی وجہ سے، کیونکہ جانوروں کو شہوات سے مغلوب کر دیا گیا ہے اور ان کی حرکات وسکنات شہوت کے سوا کچھ نہیں لہٰذا ان میں ایسی کوئی قوت نہیں جو شہوت کی مزاحمت کر سکے اور اس قوت کا ثبوت سبع کہلا سکے اور اسی طرح فرشتوں میں اللہ کا قرب حاصل کرنے کا شوق اور رغبت ہے ان کے اندر شہوت رکھی ہی نہیں گئی جو ان پر غالب آسکے اور انہیں قرب سے روک سکیں۔[35]

صبر کے احوال تین طرح کے ہوتے ہیں ایک حال تو یہ ہے کہ شہوات کو بالکل زیر کر دے اور اس میں مزاحمت کی کوئی قوت باقی نہ رہے یہ بات دوام صبر سے حاصل ہوتی ہے، اس مرتبہ پر صرف وہ فائز ہوتے ہیں جو عقیدہ پر ایسے جمے رہیں اور راہ راست سے کبھی نہ ہٹیں اور اطمینان ان کو حاصل ہو، دوسرا حال یہ ہے کہ شہوات ان پر غالب آجائیں اور مزاحمت بھی نہ کر سکیں ایسے غافل ہوئے کہ شہوات کے بندے بن گئے بد بختی ان پر مسلط ہو گئی۔"وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"[36](اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو (پہلے ہی) اس کی ہدایت دے دیتے، لیکن وہ بات جو میری طرف سے کہی گئی تھی، طے ہو چکی ہے کہ: میں جہنم کو جنات اور انسانوں سب سے ضرور بھر دوں گا) تیسرا حال یہ ہے کہ مجادلہ برابر کا ہو کبھی دینی لوازمات کو تقویت ملے اور کبھی شہوات فتح پالیں ایسے لوگ کوشش کرنے والوں میں سے ہیں کامیابی کے درجہ کمال تک نہیں پہنچ سکے [37]۔"خَلَطُواْ عَمَلاً صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا"[38]

شکر گزاری

شکر اگر پیش کے ساتھ ہو تو نعمت کی معرفت اور اس کا اظہار کرنا اور اگر زبر کے ساتھ ہو تو تھوڑا سا چارہ جو جانور کے لئے کافی ہو جائے [39]۔ ہمیں اللہ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے ہدایت سے نوازا ہو اور ایمانیات پر التزام ہونا بھی اس کی عملی تصویر ہمیں قول و عمل سے ثابت کرنا بھی ضروری ہے، شکر بنیادی طور پر اس اعتراف واقرار کے اثرات کو کہتے ہیں جو اللہ کی نعمت سے متعلق بندہ کے زبان سے جاری ہوتا ہے اور اسکے دل پر اس کی محبت اور وجود ہوتا ہے اس کے اعضاء وجوارح سے تابعداری

جھلکتی ہے۔[40]شکر بھی سالکین کی منازل میں سے ایک منزل کا نام ہے اور یہ بھی تین چیزوں سے مرکب ہے، علم، حال، عمل، علم سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال سے ہی عمل وجود میں آتا ہے، علم سے مراد کہ نعمت کو منعم حقیقی کی طرف سے ہی جانے اور مانے اور حال یہ ہے کہ منعم حقیقی کی عطا کردہ انعام سے راضی ہو اور عمل سے مراد ہی ہے کہ جو مقصود منعم حقیقی کو پسند ہو اس پر قائم رہے۔[41]"وَإِن تَعُدُّواْ نِعْمَةَ اللّهِ لاَ تُحْصُوهَا إِنَّ اللّهَ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ"[42](اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو انہیں شمار نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے)اس آیت کا مفہوم یہ بتلاتا ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی نعمت کا شمار کرنے سے عاجز ہیں اور کیسے اللہ کا شکر ادا کریں، انسان صبح وشام کھڑے ہو کر اللہ کو شکر ادا کرئے پھر بھی اس کی ایک نعمت کا حق ادا نہیں کر سکتا شکر وہ قیمتی نعمت ہے جسے اللہ نے اپنی یاد سے جوڑا ہے، اللہ تعالیٰ ناشکری سے منع کرتا ہے اور شکر کرنے والی کی تعریف کرتا ہے جو اس کی شان کے مطابق ہے اس کے تخلیقی وصف بیان کرتا ہے تو مقصد تخلیق کو سمجھتا ہے تو اس کو اچھا صلہ دیتا ہے گویا وہ اس نعمت کا چوکیدار بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ بتلاتا ہے کی شکر کا اہل وہ ہوتا ہے جو اس کی آیات سے فائدہ اٹھاتا ہے۔"أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ"[43](کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی مہربانی سے چلتی ہیں تا کہ وہ تمہیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے یقیناً اس میں ہر اس شخص کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو صبر کا پکا اعلیٰ درجے کا شکر گزار ہو)اللہ کی ایک صفت الشکور بھی ہے شکر کرنے والے کو شکور تک پہنچاتی ہے اس کی اہلیت شکر کرنے والوں میں کم ہوتی ہے:"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُواْ لِلّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ"[44](اے ایمان والو جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں رزق کے طور پر عطا کی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر واقعی تم صرف اسی کی بندگی کرتے ہو)

ہم شکر کیسے کر سکتے ہیں؟ اس بات کو پلے باندھ لینا چاہئے کی ساری نعمتیں اللہ کا کرم اور احسان ہوتی ہیں اور اللہ کی عطا پر راضی رہنا ہی شکر کی ادائیگی کا پتہ دیتی ہیں شکر قول و فعل اور دل سے ہوتا ہے مخلوق کی بھلائی دلی شکر کی علامت ہوتی ہے اور زبان سے اللہ کی تحمید و تقدیس بیان کرنا اس کی تائید حدیث شریف سے ہوتی ہے:"ان الله ليرضى عن العبد ان ياكل الاكلة فيحمده عليها او يشرب الشربة فيحمده عليها"[45](اللہ تعالیٰ اس بات پر (اپنے) بندے سے راضی ہوتا ہے کہ وہ ایک کھانا کھائے اور اس پر اللہ کی حمد کرے یا پینے کی کوئی چیز (پانی، دودھ وغیرہ) پیے اور اس پر اللہ کی حمد کرے)اور عملاً ساری نعمتوں کو اس کی بندگی کے لئے استعمال کرنا اور برائی سے بچنے کی اللہ ہی سے مدد اور توقع رکھنا۔ شکر کثرت سے کرنا بھی شکر کی ادئیگی کا ایک عملی تصور ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نعمت کی حفاظت اور اسے ضائع ہونے سے بچانا بھی شکر ہی ہے۔ شکر یہ بھی ہے کہ اللہ کے انعامات کو ایسے طور اطوا میں استعمال کرئے جو اللہ کو پسند ہوں اور ناشکری یہ ہے کہ ان نعمتوں کو بالکل استعمال نہ کرئے یا ان کو ایسے انداز سے استعمال کرئے جو برا ہو پھر اللہ تعالی کو پسند اور ناپسند چیزوں کو جاننے کے لئے دو آلے انسان کو عطا کئے ہیں ایک سننا ہے جو آیات واحادیث ہیں اور دوسرا دلی بصیرت ہے جو عموما کم اور دشوار ہے اور اسی دشواری کو دور کرنے کے لئے حضرات انبیاء کرام کو مبعوث کیا تا کہ لوگوں پر آسانیاں ہو جائیں اور وہ شکر سے بری الذمہ نہ ہو سکیں۔[46]"وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ" [47](اور وہ وقت بھی جب تمہارے پروردگار نے اعلان فرمادیا تھا اگر تم نے واقعی شکر ادا کیا تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا)"ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَى قَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُواْ مَا بِأَنفُسِهِمْ وَأَنَّ اللّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"[48](یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ اس نے جو نعمت کسی قوم کو دی ہو اسے اس وقت تک نہیں بدلنا گوارا نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت تبدیل نہ کر لیں اور اللہ ہر بات سنتا سب کچھ جانتا ہے)اس آیت سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت سے بعض ایسے لوگوں کو بھی عطا فرماتا ہے جو

اپنے عمل سے اس کے مستحق نہیں ہوتے لیکن عطاء نعمت کے بعد اگر وہ اپنے اعمال کا رخ اصلاح و درستی کی طرف پھرنے کی بجائے اعمال بد میں اور زیادتی کرنے لگیں تو پھر یہ نعمت ان سے چھین لی جاتی ہے[49]، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں کسی نعمت کے ذریعے اللہ کی نافرمانی نہ کرے بلکہ ہر نعمت کو اس کی اطاعت میں لگائے، شکر میں دو مقام ہیں اعلیٰ مقام شکور کا ہے یعنی وہ شخص ناگوار باتوں، شدید تکالیف پر بھی شکر ادا کرے ایسا تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب وہ صدق و یقین اور زہد جیسی نعمت سے مالا مال نہ ہو اور اس کا مشاہدہ نہ کر لے جو موجب شکر بن جائیں، دوسرا مقام یہ کہ بندہ کو دنیوی امور اور احوال دین میں فضیلت دی گئی ہے پھر وہ سلامت دین اور عافیت کی بناء پر اللہ کی نعمت کو عظیم سمجھے۔[50]

رضامندی و خوشنودی حاصل کرنا

جو کچھ اللہ سے چاہتا ہے اس کی قبولیت بغیر کسی تردد اور مخالفت سے ہونا، دلی سکون جو اسے اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے اور اللہ اسے چن لیتا ہے، اسے رضامندی و خوشنودی کہتے ہیں۔ مظاہر رجاء میں ایک اساسی عنصر رضا بھی ہے انسان جو اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اور اس کے ملنے کا جو تیقن ہوتا ہے اور پھر جو کچھ اسے ملتا ہے اس پر راضی ہوتا ہے اور یہ رجا اسے اطمینان سے پر نور کرتا ہے۔ رضا دو طرح کی ہوتی ہے ایک اللہ تعالیٰ کا بندے سے راضی ہونا دوسری بندہ کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا، رضائے الٰہی کی حقیقت یہ کہ بندہ کے لئے ثواب، نعمت کا درجہ ہوتی جو اس کو عطا کیا جاتا اور بندہ کی رضامندی اصل میں اللہ تعالیٰ کے احکامات پر ثابت قدم ہونا اور اس کی تعمیل کے لئے ہر طرح کی قربانی سے گریز نہ کرنا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا مقدم اور اعلیٰ ہے بندہ کی رضا، اللہ تعالیٰ کی رضا سے ہی وابستہ ہے اور اللہ کی رضا قائم ہونا اس کی ذات سے ہی ممکن ہے اس کا معنی یہ ہے کہ بندے کا دل قضائے منع اور قضائے عطا دونوں پر یکساں مطمئن اور راضی رہے۔[51] یہ وہ رضامندی ہے جو ایک انسان کو تکریم دیتی ہے کیونکہ وہ اللہ کے حکم کی تقصیر سے بچتا ہے اور اللہ کی تقسیم پہ راضی ہوتا ہے، دعا کرنا بھی رضامندی ہی ہے۔ یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہئے کی دعا کرنا رضامندی کی خلاف نہیں ہے بلکہ بندگی اختیار کرنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ بہت زیادہ دعا فرماتے تھے کیونکہ یہ رضامندی کے اعلیٰ مقامات میں سے ہیں:" اللهم انی انشدك عهدك ووعدك، اللهم ان شئت لم تعبد بعد اليوم"[52](حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، انھوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ اپنے خیمے میں اللہ کے حضور یہ عرض کر رہے تھے "اے اللہ! میں تجھے تیرے عہد اور وعدے کا واسطہ دیتا ہوں (کہ مسلمانوں کو فتح عطا فرما)۔ اے اللہ! اگر تیری یہی مرضی ہے کہ آج کے بعد تیری عبادت نہ ہو۔" اتنے میں حضرت ابو بکرؓ نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: اللہ کے رسول ﷺ! بس یہ آپ کے لیے کافی ہے، آپ نے اپنے رب سے بہت الحاح اور زاری سے دعا کی ہے۔ آپ ﷺ زرہ پہنے ہوئے تھے اور یہ پڑھتے ہوئے باہر نکلے " : عنقریب کفار کی جماعت شکست سے دوچار ہو جائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت بہت بڑی آفت اور تلخ تر چیز ہے) اسی طرح انبیاء کرم علیہم السلام کے اسوہ سے بھی یہ بات ملتی ہے کہ پہلے اسباب اختیار کیا جاتا ہے اور پھر اللہ پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے۔"وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ"[53](اور ہمیں شوق اور رعب کے عالم میں پکارا کرتے ہیں اور ان کے دل ہمارے آگے جھکے ہوئے ہیں) یہ بات مزید واضح ہوتی ہے کہ مغفرت چاہنا، دعا کرنا اور گناہوں سے بچنا اور مطلوب اسباب کو اختیار کرنا رضامندی کے منافی نہیں ہے اللہ کی بندگی دعا سے بھی حاصل ہوتی ہے دعا سے بھی اللہ کو ذکر ہوتا ہے رقت قلب، خشوع و خضوع حاصل ہوتا ہے جو دل کو جلا بخشتا ہے۔[54] انسان تمام نافرمانیوں سے بچتا ہے اگر ایسا نہ کرے تو بندہ اللہ کی بندگی سے دور ہو جاتا ہے در اصل بندگی صبر و توکل، رضامندی سے ہی پروان چڑھتی ہے، ناراضگی سے غم غصہ، تکلیف دل کا مضطرب ہونا انسانی فطرت کا خاصہ ہے جب کہ رضامندی ان سب سے انسان کو خلاصی دلاتی ہے اور دنیا کو ہی آخرت سے پہلے جنت بنا دیتی ہے، رضا ایک ثمرہ جو

کہ مقربین کے اعلیٰ مقامات میں سے ہے اور اسکی حقیت سے اکثر لوگ آگاہ نہیں، رضائے الٰہی جو جنتیوں کو ملے گی وہ دوام کے باعث ہے اور اسی غایت کو جاننا رضا ہے۔[55] عبدیت کے اکمال کے لیے ضروری ہے کہ بندہ مؤمن ان تمام احکامات کی بجا آوری کرتا رہے، چاہے اسے ان کی تعمیل میں دقت نفس ہی کیوں نہ محسوس ہو، اگر وہ عبدیت کے پیمانہ کو اپنی رضامندی اور خوشنودی سے تولے گا تو پھر وہ اپنے رب کی بندگی سے کوسوں دور ہوتا جائے گا، تکلیف، پیشانی، بے سکونی جیسے عوارض سے مطلوب مؤمن تبھی بچ سکتا ہے، جب وہ ان تمام عوارض اکتسابیہ اور وھبیہ میں توجہ اپنے رب کی طرف خالص رکھے اور یہی اخلاص ان تمام عوارض سے نکلنے کی کلید ہے، دنیا میں رضامندی اور خوشنودی، اخروی خوشی کا دروازہ کھولتی ہے، اس بات کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کا حکم چلتا رہتا ہے جو بندہ مؤمن کے لیے ہر دم اہم ہوتا ہے اس پر بھی حقیقت سے کسی کو آنکھیں چرانے کی ضرورت نہیں کہ جو انسان اللہ کی صفت عدل سے راضی نہیں رہتا دراصل وہ اہلیان ظلم وجور میں سے ہوتا ہے۔ رضامندی کی حقیقت کو سمجھنا ہو تو اپنے دل کو ٹٹولنا ہوتا کہ وہ کس چیز سے مطمئن ہوتا ہے، زبانی اعتبار سے رضا کی حقیقت کو نہیں سمجھا جا سکتا، جو کچھ انسان کی رضا اور اس کے متعلقات صادر کرتے ہیں اصل میں رضا اسی پر دلالت کرتی ہے، لیکن حقیقی رضا اس وقت متحقق ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ اس کے لیے وہ کچھ کرتا ہے جو اس کے مقدر اور نصیب میں ہوتا ہے۔ رضا سے ہی انسان نافرمانیوں سے بچتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو بندہ اللہ کی بندگی سے دور ہو جاتا ہے در اصل بندگی صبر وتوکل اور رضامندی کو پروان چڑھاتی ہے، ناراضگی، غصہ، تکلیف، دل کا اضطراب ان ساری ظاہری وباطنی تکلیفوں سے رضا کی خلاصی دلاتی ہے اور ایک مطلوب مؤمن کی دنیا کو آخرت سے پہلے ہی جنت بنا دیتی ہے۔

ذکر الٰہی

ذکر، نسیان کا مد مقابل ہوتا ہے کسی چیز کو زبان سے کہنے پر محمول ہوتا ہے اگر پیش سے ہو تو اس کا معنی بنتا ہے کہ اسے مت بھولو اور اگر زیر سے پڑھا جائے تو اس کا معنی بزرگی اور بلندی ہوتا ہے[56]۔ ذکر اگر زیر سے ہو تو اس کا لغوی معنی کسی کو یاد کرنا، کسی چیز کا زبان پر جاری ہونا، اور اگر پیش سے ہو تو حمد وثنا، اللہ سے دعا کرنا۔[57] امید کے مظاہر میں ایک مستحکم اور اہم مظہر ذکر الٰہیٰ ہے، قرآن کریم نے مؤمنین کی صفات میں اس چیز کو بھی شامل کیا جو غور وفکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھتے ہیں اور وہ نشانیاں ان کو اللہ کا ذکر کرنے پر مائل کرتی ہیں[58]، ذکر کی اہمیت اور افادیت متعدد احادیث میں اس طرح بیان کی گئی ہیں کی جس سے ذکر کی روحانی ترقی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ذکر کرنے والے کو زندہ اور نہ کرنے والے کو مردہ سے تشبیہ دی[59] اور حیات حیوانی نہیں بلکہ حیات انسانی کا لازمہ قلب وروح کی زندگی ہے اور حیات روحانی کے بغیر انسان چلتا پھرتا ہے اور اس کے تقاضے بھی پورا کرتا ہے لیکن وہ مردہ ہوتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ہمیں ہر لمحہ ہر لحظہ ہر موڑ پر ذکر الٰہی کا ہی درس دیا ہے۔ گھر سے نکلیں تو دعا بازار جائیں تو دعا، سواری پر سوار ہوں تو دعا، شہر میں داخل ہوں تو دعا، پانی پئیں تو دعا، کھانا کھانے سے فارغ ہوں تو دعا، مسجد میں داخل ہوں تو دعا اور نماز تو دعاؤں کا مجموعہ ہے۔ مسجد سے باہر نکلیں تو دعا لباس پہنیں تو دعا۔ دین اسلام نے انسان کو کسی بھی موڑ پر بے رہبر ونہیں چھوڑا ہر مقام پر ذکر الٰہی کی تلقین کی ہے۔ حضوری دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہمیشہ عبادتوں پر مقدم ہوتا ہے بلکہ اسی سے تمام عبادتوں کے شرف سے مالا مال کیا گیا ہے اور اللہ کا ذکر ہی عملی عبادتوں کی علت ووجہ ہے یہی فکر اس کی ذات سے چمٹ جائے تو اللہ کی توفیق سے اس پر ہیشگی کرنے سے اس کے ساتھ مانوس ہو تا جائے گا اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس قدر زیادہ کہ تکلیف سے تب بھی ذکر کو ہی محبوب سمجھے شروع میں تکلف سے کرئے گا پھر ایک وقت ایسا بھی ہو گا کی ذکر کے سوا اس سے کچھ صادر نہیں ہو گا، مرنے کے بعد دنیاوی آسائش منقطع ہا جائے گی تو اخروی آسائش تو صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور مرنے کے بعد اس کے موانع بھی نہ رہیں گئے تو فانی

زندگی تو فنا ہو جائے گی اور ذکر تو بقا ہے اور بقا کو ہی عروج ہے انسانی زندگی کی حاجتیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اسے ذکر روکتی ہیں ذکر مانع جب معدوم ہو جائے گا تو ذکر کرنے والے کو ہی قرار آئے گا۔

خدمت خلق

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں ایک اپنے خالق سے تعلق اور واسطہ اور دوسرا مخلوق سے تعلق اور رابطہ۔ خالق سے عبودیت اور انابت کو اپناتا ہے اور مخلوق کی نسبت خدمت خلق کو شعار بناتا ہے، مخلوق کی خدمت اور ان سے حسن سلوک دنیاوی اور اخروی فلاح کی ضمانت ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"الخلق عیال الله فاحب الخلق الی الله من احسن الی عیاله"[60](مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو اس کے کنبے سے اچھا سلوک کرتا ہے۔) خدمت خلق ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں جسمانی خدمت، اخلاقی رویہ، مالی اعانت اور ممکنہ تحفظ شامل ہیں اور قرآن وحدیث کی ہدایات سے معلوم ہوتا کہ حسن خلق دین کی روح ہے قرآن کریم نے تصور نیکی کو واضح کرتے ہوئے اس کی حقیقت اور ماہیت کو کھول کر بیان کر دیا ہے[61]، مالی وجسمانی اعانت، اجتماعی زندگی کی روح اور اس کے سکون کا ذریعہ ہے جس سے معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں، باہمی تعاون کی تلقین نبی کریم ﷺ نے کچھ یوں فرمائی ہے:"مثل المؤمنین فی تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم کمثل الجسد اذا اشتکیٰ عضو تداعی له سائر الجسد با لسهر والحمی '"[62](ایمان داروں کی اپس کی رحمت اور محبت اور مہربانی ایسی ہے جیسے ایک جسم کی مانن جب کسی عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو تمام بدن کے اعضاء بیماری اور حدت کو بلاتے ہیں)حاجت مندوں کی مدد کرنا اور مشکل حالات سے دوچار انسانوں کو سہارا دینے والے کو نبی کریم ﷺ نے اللہ کی راہ میں سعی کرنے والا قرار دیا ہے۔[63]، گویا خدمت خلق انسانی زندگی میں امید کی بار آوری کا بڑا ذریعہ ہے اور انسانی معاشرے کی تربیت کا ایک مؤثر ہتھیار ہے اس کے باعث انسان نفس کے فریب سے نجات حاصل کر سکتا ہے، دنیا میں فساد کا بڑا سبب ایک انسان کی بڑھی ہوئی ہوس، بخل اور جبر وتسدد ہے یہی ہوس معاشرہ میں استحصال پیدا کرتی ہے نبی کریم ﷺ نے انسان کی اس بیماری کا علاج خدمت خلق سے کیا ہے کیونکہ خدمت خلق کے لئے محبت، شفقت اور ہمدردی اور اخلاص کے ساتھ ساتھ ایثار اور قربانی کا جذبہ ایک ناگزیر عمل ہے۔ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے مدنی الطبع ہے مل جل کر رہنا ہی معاشرہ بناتا ہے خدمت خلق بنیادی طور پر لوگوں کی معاشرتی احتیاج کو پورا کرنے کا نام ہے خیر خواہی اور خبر گیری کا تصور انسانی معاشروں میں ملتا ہے تو اس کی ابتداء جاننے کے لئے خود نبی کریم ﷺ کے بعثت پہلے جو رویہ روا فرمایا اس کی دلیل حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وہ بات ہے جو پہلی وحی کے نزول کئ بعد جب آپ ﷺ گھر تشریف لائے اور سارا واقعہ بیان فرمایا تو حضرت خدیجہ نے آپ کی ہمت بڑھاتے ہوئے جو الفاظ آپ ﷺ کی شخصیت کے لئے بیان کئے تھے وہ خدمت خلق پر ہی مستدل ہیں۔ خدمت خلق کے زمرے میں کئے جانے الے اعمال کو بغائر نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کو اسلامی شریعت میں صدقہ جاریہ کا نام دیا گیا ہے اور صدقہ جاریہ کا تصور اس امید کو واضح کرتا ہے جو اس عمل کو سرانجام دینے والے کی دل میں ہوتی ہے، وہ امید ہے جو کرنے والے کو اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اعمال اس کے نامہ میں مکتوب ہو رہے ہوتے ہیں حدیث شریف میں ہے: سات قسم کے اعمال ہیں جن پر آخرت میں اجر ملتا ہے اور اجر ملنا اساسی اعتبار سے امید میں ہی پنہاں ہے نبی کریم کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"ان ممایلحق المومن من عمله وحسناته بعد موته علما علمه ونشره،وولدا صالحاترکه،ومصحفاورثه، او مسجدا بناه او بیتا الابن السبیل بناه، اونہرااجراه،اوصدقةاخرجہامن ماله فی صحته وحیاته،یلحقه من بعد موته "[64](مومن کو وفات کے بعد جو نیک عمل پہنچتے ہیں، ان میں یہ بھی ہیں: جس علم کی تعلیم دی اور اسے پھیلایا، نیک اولاد جو پیچھے چھوڑی، قرآن مجید کا نسخہ جو کسی کو

وراثت میں ملا، مسجد جو اس نے تعمیر کی، مسافر خانہ جو اس نے قائم کیا، نہر جو اس نے جاری کی یا صدقہ جو اس نے اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں نکالا، ان سب کا ثواب اس کی موت کے بعد اسے ملتا رہتا ہے) خدمت وہ جذبہ امید ہے جو ذاتی اغراض، شخصی مفادات اور نفسانی خواہشات پر غالب ہوتا ہے، یہی خدمت عزت وتوقیر کا باعث بنتی ہے جو آخرت میں ایک انسان کو وسعت دے گی۔"من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب الآخرة ومن ستر على مسلم ستره الله في الدنيا والآخرة والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه"[65] خدمت خلق میں جتنا خلوص کا مظاہرہ ہوگا اتنا ہی اجر وثواب کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيْ إِسْرَائِيلَ لاَ تَعْبُدُونَ إِلاَّ اللّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَّذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْناً وَّأَقِيمُواْ الصَّلاَةَ وَآتُواْ الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلاَّ قَلِيْلاً مِّنكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ"[66] (اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور والدین سے اچھا سلوک کرو گے اور رشتہ داروں سے بھی اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی، اور لوگوں سے بھلی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا (مگر) پھر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب (اس عہد سے) منہ موڑ کر پھر گئے)"وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لاَ تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلاَ تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُم مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ"[67] (اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے پھر تم نے اقرار کیا تھا اور تم خود اس کے گواہ ہو) اس آیت مبارکہ سے وضاحت ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کو جس عہد کا مکلف بنایا گیا تھا کہ وہ ہمیشہ ظلم وزیادتی سے باز رہیں گئے لیکن انہوں نے اس عہد کی قدر نہیں کی بے رحمی، شقاوت، خون چوسنا جیسے اعمال کی وجہ عہد کو پامال کر دیا، قرآن کریم اصل میں مطالبہ کرتا ہے کہ انسانوں کی خدمت آسانیاں فراہم کرتی ہیں زندگی کو خوشگوار بناتی ہے، انسانیت کے لئے دوڑ دھوپ کرنا محنت ومشقت برداشت کرنا، معذور اور محروم افراد کو مایوس نہ چھوڑنا، زندگی کے اسباب راحت دے کر ان میں زندگی کی رعنائیاں پیدا کرنا، امید وتمنا جگانا اور امید رکھنا ہی تو ہوتا ہے۔ مالداروں کے مال کو نعمت تبھی قرار دیا جاسکتا ہے جب اس فراوانی کو ان کے لئے استعمال کریں جو محروم ہیں، جو سائل ہیں، محرومین اور سائلین کی مدد ونصرت اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی امید ہو سکتی ہے جب کہ اس امید کا حصول مخلوق کی خدمت ہی میں مضمر ہے۔ اسلام نے مخلوق کی خدمت کو خالق کی عبدیت پر محمول کیا ہے حدیث قدسی ہے:[68] انسان کو مقصد تخلیق اللہ کی عبادت ہے اور اللہ کا تقرب اور رضامندی پانے کے متعدد ذرائع ہوتے ہیں جن میں بدنی تقرب ہے جس میں رکوع وسجود اللہ کے ساتھ محبت اور امید کا دیا روشن کرتا ہے اور مالی تقرب جس میں قربانی اور خدمت خلق امید کو تمکین وتکمیل کرتی ہے، ذمہ داری کی بجا آوری بھی تقرب کا ذریعہ ہوتا ہے تکلیف دینے سے باز رہنا، آمد ورفت میں رکاوٹ نہ ڈالنا، گندگی نہ پھیلانا، کسی سے نہ الجھنا، بدزبانی سے گریز کرنا، معروف ومنکر کی تلقین کرنا، یہ سب کچھ نبی کریم ﷺ نے ایک معاشرتی ضابطہ میں واضح فرمادیا دین خیر خواہی کو ہی کہتے ہیں۔ ایک دوسری مشہور حدیث شریف میں حقوق کی وضاحت کچھ اس طرح فرمائی:"للمسلم على المسلم ست بالمعروف يسلم عليه اذالقيه ويجيبه اذادعاه ويشمته اذا عطس ويعوده اذا مرض ويتبع جنازته اذا مات ويحب له ما يحب لنفسه"[69] (ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں ملاقات کے وقت سلام کرے، اس کی دعوت قبول کرے، اس کی چھینک کا جواب دے، بیماری کے وقت اس کی عیادت کرے، جب اس کی وفات ہو تو اس کے جنازے میں شریک ہو، اور جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسرے بھائیوں کے لیے بھی پسند کرے)۔

دعااور التجاکااظہار کرنا

انسانی روح کی اصل تربیت کے لئے دعا ایک زینہ ہے، دعا سے ہی انسان کی عبودیت اور حاجت مندی کا اظہار ہوتا ہے اور اسی دعا سے انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت بالغہ اور حاکمیت اعلیٰ کا اعتراف واقرار کرتا ہے اور دعا تشکر وامتنان کا وسیلہ اور عجز ونیاز کا قرینہ بھی ہے جس سے انسانی روح میں قرار اور بالیدگی جنم لیتی ہے، دعا انسان کے سوز وگداز کا سبب بنتی ہے، اسی سے کبر وغرور اور خود پسندی اور خود غرضی جیسے مہلک امراض روح سے بچاؤ کا حقیقی اور قدرتی علاج بھی ہے، دعا ہی انسان کے لئے عزت نفس کے تحفظ کا احساس اور توجہ، رجوع اور انابت الی اللہ کا اعتماد دیتی ہے اس کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت سے گہرا ربط اور ضبط پیدا ہوتا ہے جس سے انسان کسی حال میں بھی منقطع نہیں رہ سکتا، دعا کی لذت اور دل میں اس کی تاثیر کے بارے میں وہی جان سکتا ہے جسے اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلانے، سر جھکانے، گڑگڑانے، اور پرنم آنکھوں سے کچھ مانگنے اور کچھ عرض کرنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے یہ دعا ہی ہے کہ مسلمان اسباب کی کوتاہی کے باوجود مشکلات کا مقابلہ کرنے پر آمادہ رہتا ہی یہی دعا انسان کو اپنے رب کے قریب کر دیتی ہے اپنی مشکلات اور مصائب میں اسے پکارتا ہے اور اسی کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور جب انسانی زندگی کا توازن بگڑتا ہے اور اس کی نفسیاتی کیفیات بدلتی ہیں تو ایسے لمحات میں دعا تسکین کا باعث ہوتی ہے۔[70] اور اس تسکین کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کرتا ہے:"وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُواْ لِي وَلْيُؤْمِنُواْ بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ"[71](اور(اے پیغمبر)جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو(کہہ دو کہ)میں تو(تمہارے)پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں)دوسرے مقام پر فرمایاہے:"وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ"[72](تمہارارب کہتاہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا، جولوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)مندرجہ بالا آیت مبارکہ سے تین باتیں مترشح ہوتی ہیں، انہیں ضرور سمجھ لیناچاہئے:

☆--- انسان دعا اس ہستی سے مانگتا ہے جس کو وہ سمیع وبصیر اور فوق الفطرت اقتدار کا مالک سمجھتا ہے اور دعا مانگنے کا محرک دراصل انسان کا اندورنی احساس ہوتا ہے کہ عالم اسباب کے تحت فطری ذرائع ووسائل اس کی کسی تکلیف کو دور کرنے یا کسی حاجت کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں، اقتدار کی مالک ہستی سے رجوع کرنا ناگزیر ہوتا ہے، اس ہستی کو انسان بے دیکھے پکارتا ہے، ہر وقت ہر جگہ، ہر حال میں پکارتا ہے۔

☆--- یہ بات امر واقعی ہے کہ قادر مطلق اور مدبر کائنات اور سمیع وبصیر ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور وہی کلی طور پر اختیارات کا مالک ہے دوسری کوئی ہستی بھی اس پوری کائنات میں ایسی نہیں جو دعائیں سننے اور ان کی قبولیت یا عدم قبولیت کی صورت میں کوئی کاروائی کرنے کا اختیارات رکھتی ہے۔

☆--- اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں سے دعا مانگنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص درخواست لکھ کر اصل حاکم کو چھوڑ کر وہاں موجود سائلین سے ہاتھ جوڑ کر اپنی حاجتیں مانگے اور التجائیں پیش کرئے تو یہ سخت گستاخی بن جاتی ہے کہ اصل حاکم ذی اختیار سامنے موجود ہو اور عین اس کی موجودگی میں اسے چھوڑ کر کسی دوسرے کے سامنے التجائیں کرئے۔[73]

اللہ تعالیٰ کے حضور الحاح وگریہ زاری بندہ مؤمن کی ظاہری حیات کا بنیادی عنصر ہے، اللہ تعالیٰ سے مانگنے میں کسی قسم کی جھجک وشرم کے ساتھ ساتھ شک وشبہ جیسی تمام چیزوں سے بچنا لازم ہے، عموماً دو لفظ ہم بولتے ہیں عزم وجزم، دعا کی ترکیب میں دونوں کا ہونا ضروری ہے، عزم دراصل اس چیز کی شدت طلب کے لیے ہے اور جزم اس کی طلب میں ضعف اور نقص سے بچنا

مراد ہوتا ہے اور تیسری ترکیب یہ ہے کہ اس کی طلب میں تکرار ہونا چاہیے، پھر مانگنے والا اپنی طلب میں جتنی کوشش کرے گا اتنی زیادہ امید رکھے گا اور مایوسی سے بچے گا۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے لئے دعا کا دروازہ بغیر کسی واسطہ سے کھلا رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ اے نبی میں قریب ہوں بلکہ معا یہی کہا میں مانگنے والے کی دعا سنتا ہوں، اللہ سے سوال کرتے ہوئے مسلمان کو یہ فقرہ اپنی دعاؤں میں شامل رکھنا چاہیے کہ میں فقیر ہوں یعنی محتاج ہوں۔[74]، فقر حقیقی ہے ہر چیز میں فقر مراد ہو سکتا ہے اس لفظ میں سے کسی کو استثنا نہیں ہے غنی بھی فقیر ہے فقیر بھی فقیر ہے حاکم بھی فقیر ہے مخلوق بھی فقیر اور محتاج ہے سب سے بڑی بات یہ ہونی چاہئے کہ اللہ کے سامنے گریہ وزاری کی جائے اور اپنی احتیاج کا باقاعدہ ذکر کیا جائے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:"اذا دعا احدكم فليعزم المسألة ولايقولن اللهم ان شئت فاعطنا فإنه لا مستكره له"[75] (جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو یقین وقطیعت کے ساتھ سوال کرے۔ یوں نہ کہے: اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے تو مجھے دے دے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور کرنے والا نہیں ہے) سوال کا ارادہ اس کی شدت طلب سے معلوم ہوتا ہے اور اس کا جزم طلب میں محتاجی ہونے میں ہی مضمر ہے اور اس کو مشیت پر نہیں چھوڑا جا سکتا بلکہ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن ہونا چاہیے، دعا میں الحاح وگریہ زاری میں مبالغہ اس چیز میں شدت طلب اسکے بڑا ہونے کا ثبوت ہوتا ہے، فانہ لا مکرہ لہ سے مراد یہ ہے کہ جو چیز مطلوب ہوتی اللہ پر وہ چیز دینا آسان ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی رضا کے بغیر کچھ نہیں ملتا، مانگنے والے کے لئے ضروری اور مناسب ہے کہ وہ دعا میں کوشش کرتا رہے اور دعا پوری ہونے کی امید رکھے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو وہ بڑا کریم اور مہربان ہے، کوئی شخص بھی دعا سے باز نہ آئے چاہے تقصیر، کوتاہی غفلت اس کے علم میں ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر دیکھا جائے تو ابلیس نے شر کی دعا کی تھی اور وہ منظور بھی ہوئی تھی:﴿قال رب انظرني الى يوم يبعثون﴾[76] دعا قبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ دعا مانگتے وقت اپنے گناہوں کو یاد کرنا، اللہ کا خوف طاری ہونا، بے اختیار رونا آجانا، بدن کے روئیں کھڑے ہو جانا، اس کے بعد اطمینان قلب اور ایک قسم کی فرحت محسوس ہونا، بدن ہلکا معلوم ہونے لگنا، گویا کندھوں پر سے کسی نے بوجھ اُتار لیا ہو۔ جب ایسی حالت پیدا ہو تو اللہ کی طرف خشوع قلب کے ساتھ متوجہ ہو کر اس کی خوب حمد وثنا اور درود کے بعد اپنے لئے، اپنے والدین، رشتہ داروں، اساتذہ اور مسلمانوں کے لئے گڑگڑا کر دُعا کریں۔ ان شاء اللہ اس کیفیت کے ساتھ کی جانے والی دعا ضرور قبول ہو گی۔ دعا کی قبولیت میں جلدی نہیں کرنی چاہئے کیونکہ دعا کی قبولیت کا وقت معین ہے اور نااُمید بھی نہیں ہونا چاہئے اور یوں نہیں کہنا چاہئے کہ میں نے دعا کی تھی مگر قبول نہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناامید ہونا مسلمان کا شیوہ نہیں۔ دعا کی قبولیت میں اللہ تعالیٰ کبھی کبھی مطلوب سے بہتر کوئی دوسری شيء انسان کو عطا فرماتا ہے، یا کوئی آنے والی مصیبت دور کر دیتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دعا مظہر عبدیت اور ایک اہم عبادت ہے۔ دعا مضطرب قلوب کے لئے سامان سکون، گمراہوں کے لئے ذریعۂ ہدایت، متقیوں کے لئے قرب الٰہی کا وسیلہ اور گناہگاروں کے لئے اللہ کی بخشش ومغفرت کی بادِ بہار ہے۔ اس لئے ہمیں دُعا میں ہر گز کاہلی وسستی نہیں کرنی چاہئے، یہ بڑی محرومی کی بات ہے کہ ہم دشمنوں سے نجات اور طرح طرح کی مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے بہت سی تدبیریں کرتے ہیں مگر وہ نہیں کرتے جو ہر تدبیر سے آسان اور ہر تدبیر سے بڑھ کر مفید ہے (یعنی دعا)، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اس اہم اور مہتم بالشان عبادت کے ارکان وشرائط وواجبات ومستحبات کے ساتھ اور منہیات ومکروہات سے بچتے ہوئے اپنے خالق ومالک کے سامنے وقتاً فوقتاً خوب دعائیں کریں۔ دعا کے وقت اسباب کی طرف نظر نہ ہو بلکہ اسباب وتدابیر سے قطع تعلق ہو کر مسبب الاسباب کی ذات پر یقین رکھنا ہو گا، دعا میں حد سے تجاوز کرنا غلط ہے، یعنی کسی ایسے امر کی دعا کرنا جو شرعاً یا عادۃً محال ہو یا جو بات پہلے ہی طے ہو چکی ہو، دعا میں کسی قسم کا تکلف یا قافیہ بندی نہ کرے کیونکہ یہ امر حضور قلب سے باز رکھتا ہے اور اگر خود بخود بمقتضائے طبیعت قافیہ بندی

ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔"الدُّعَاءُ سِلاحُ الْمُؤْمِنِ"[77] دُعا کو ہتھیار سے تشبیہ دینے کی خاص حکمت یہی ہو سکتی ہے کہ جس طرح ہتھیار دشمن کے حملہ وغیرہ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، اسی طرح دعا بھی آفات سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔

امر بالمعروف ونھی عن المنکر

"والاعتبار من المعروف الطاعات ومن المنكر المعاصي التي انكرها الشرع"[78] (ظاہری طور پر معلوم ہوتا ہے کہ معروف میں تمام اطاعتیں شامل ہیں اور منکر سے مراد وہ تمام معاصی ہیں جن کو شریعت نے ناپسند قرار دیا ہے)"المعروف اسم لكل فعل يعرف بالعقل او الشرع حسنه والمنكر ما ينكر بهما"[79] (معروف سے مراد وہ فعل ہے جس کا اچھا ہونا عقل اور شرع سے معلوم ہو اور منکر وہ ہے جسے عقل وشرع دونوں ناپسند کرتے ہوں) قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں (امر بالمعروف ونھی عن المنکر) معروف ومنکر کو بیان کیا گیا ہے ان آیات کو تین طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلی قسم تو وہ آیات ہیں جن میں معروف ومنکر کو بطورِ اصطلاح اکٹھے ذکر کیا گیا ہے[80] دوسری قسم وہ آیات ہیں جن میں معروف کو بطورِ اصطلاح اکیلے ذکر کیا گیا ہے[81]، تیسری قسم وہ آیات ہیں جن میں منکر کو بطورِ اصطلاح اکیلے ذکر کیا گیا ہے۔[82] امر بالمعروف ونھی عن المنکر ایک ایسی عبادت ہے جو نبوت کی وراثت ہے، جو اغراض ومقاصد کے اعتبار سے اعلیٰ وارفع درجہ رکھتی ہے۔ ایک انسان کو تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر خوب مقابلہ کرنا ہو گا اور نیکی اور بدی کے مقابلہ میں غیر جانبداری حقیقت میں بدی کی حمایت کی طرح ہے، افرادِ امت میں سے ہر ایک پر ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ اسی کوشش وفکر میں لگا رہتا ہے کہ اپنے گھر سے لے کر معاشرہ تک تمام افراد سے بطورِ انسانیت کے ناطے اس بات کا غماز بن کر سامنے آئے کہ اللہ کی مان کر زندگی گزارنے والا بن جائے، انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے جتنی آلودگیاں جو گناہ کی طرف لے جانے والی ہیں ان سے خود کو باز رکھنا اور دوسروں کو متنبہ کرنے کے لیے کسی سند وامتیاز کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آگے بڑھنا ہو گا۔ یہ کام بڑی بصیرت اور حکمت سے کرنا ضروری ہے، جس طرح دنیاوی نظام میں زمین کا ہموار ہونا، زرخیز ہونا اچھی فصل کے لیے ضروری ہے اسی طرح بھلائی کی تلقین کے لیے عمدہ طریقہ، اچھے الفاظ کا چناؤ بھی ضروری ہے جس سے اسلامی تعلیمات پر عمل بھی ہوتا ہے اور عمل کے ذریعے وہ تعلیمات محفوظ بھی رہتی ہیں اور ہم اپنی اپنی نیت سے ان اعمال کو جوڑتے ہیں تو یہ تعلق ہمیں دنیاوی طور پر لطف وکرم اور اخروی اعتبار سے نجات کا ذریعہ بھی ہے، اگر ہمیں معلوم ہو کہ ہماری بھلائی کی بات کو سننے والا کوئی نہیں، بلکہ اگر کوئی سننے والا تو ہے لیکن وہ شریعت کے حکم کی توہین کا مرتکب ہو سکتا ہے تو پھر اس کے حق میں بہتری یہ ہے کہ ہم خاموش رہیں تاکہ وہ کسی بھی پہلو سے دین وشریعت کے قانون کی خلاف ورزی دیدہ دلیری سے نہ کر سکے، اگر ہم زور زبردستی سے بات منوانے کے لیے آگے بڑھیں تو ہمیں اپنے ذہنوں میں پختگی سے یہ بات رکھنی چاہیے کہ ہمیں وعظ ونصیحت کرنے والا بنایا گیا ہے، وعظ ونصیحت کو منوانے والا نہیں بنایا گیا، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:"فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ"[83] (اب (اے پیغمبر) تم نصیحت کیے جاؤ۔ تم تو بس نصیحت کرنے والے ہو۔ آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لیے مسلط نہیں کیا گیا) امر بالمعروف ونھی عن المنکر کرنے والے کو معصوم عن الخطاء ہونا شرط نہیں ہے اور یہ بات اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ بعض اوقات آقا اپنے ملازموں کو جس کام سے روک رہا ہوتا ہے خود اس کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک کا ترک دوسرے واجب کے ترک کو مستلزم نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی بات کو بطورِ تزکیہ نفس بتلا رہا ہے لیکن خود اس کا عمل اس پر نہیں ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ عمل کرنا علیحدہ ذمہ داری ہے اور دوسروں کو بھلائی کی بات بتلانا اور برائی سے منع کرنا علیحدہ ذمہ داری ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور اس بات کو نظر انداز کرنا ہے کہ کہنے والا کون ہے اور اگر کہنے والے کا عمل اس کی بات کی نفی کرتا ہے تو حدیث میں اسے جہنم میں پھینکے جانے کی وعید سنائی گئی

ہے۔[84] امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اطلاق مختلف اسلوب سے کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیں قرون اولیٰ سے عملی تماثیل کو اس میں پیش کریں تو ہمیں جاننا چاہیے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام نے اپنے قول و فعل اور انابت الٰہی، تعامل، سنت کی بجا آوری سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو سر انجام دیا۔ حضرات مفسرین کرام نے تفسیری نکات اور تفسیری حواشی کے ذریعے امت کے عالی اور عامی افراد تک ان تمام بھلائیوں اور برائیوں کی بابت آگاہ کر دیا جو کلام الٰہی سے مترشح ہوتی تھیں، اسی طرح حضرات محدثین نے نبی پاک علیہ السلام کے اقوال، افعال، احوال، تقریرات کی ایسے انداز سے چھان پھٹک کی کہ ہر چیز نکھر کر امت کے سامنے آ گئی، تو یہ بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک اسلوب تھا۔ حضرت فقہاء کرام نے قرآن وحدیث سے منطوق اور منصوص مسائل کو سامنے رکھتے ہوئے اور غیر منطوق اور غیر منصوص مسائل پر اسی طرح پہلے استنباط اور پھر منطبق کیا کہ رہتی دنیا تک آنے والے مسلمان ان کی اس کاوش کے رہین منت رہیں گے اور ہر پہلو بھلائی اور برائی کا حضرات فقہاء نے قائم کیا۔ سیرت نگاروں نے حضور نبی کریم علیہ السلام کی سیرت اقدس کے تمام پہلوؤں کو آپ کی حیات مقدس کی ایک ایک جزئی کو ایسے اصولوں میں ڈھال دیا کہ سیرت نگاری کو ایک سمت اور طریقہ فراہم کیا جو بھلائی اور برائی کے درخشاں جوڑ کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ اور وسیلہ بنا۔ مؤرخین نے اسلام کے روشن پہلو زمانہ کی کی رعایت اور مسلمانوں کے لیے عبرت ومثال کو پیش کر کے اچھائی اور برائی کو جانچنے کا ایک پیمانہ وضع کیا، اہل ثروت حضرات نے اپنے اموال کو خرچ کر کے مساجد ومدارس کو قائم کر کے ایک زاویہ نظر سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ترویج واشاعت کی۔ حفاظ کرام نے قرآن کریم حفظ کر کے، علماء کرام نے علمی کتابیں تحریر کر کے، خطیبوں نے اپنے وعظ ونصیحت سے، خانقاہوں سے ظاہری وباطنی صفائی ستھرائی سے اس فریضہ کو اپنے اپنے انداز اور اسلوب دعوت سے سر انجام دیا۔ مجاہدین نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ابدیت کو تعمیل وتمکین کے لیے اپنے خون سے سینچا ہے۔ معروضی حالات کو مدّ نظر رکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ مسجدوں میں ہر وقت اذان وجماعت کی ادائیگی، مدارس سے قرآن وحدیث کی تعلیم وتربیت سے لے کر مسلمانوں کی خیر خواہی ایک فریضہ کی تکمیل ہی ہے۔ مختلف سماجی جماعتیں، انجمنیں، تنظیمیں اپنی اپنی بساط اور قوت کے مطابق غیر اسلامی قوتوں کے ساتھ محاذ پر سرگرم ہیں لیکن سب سے بڑی کوتاہی اس فریضہ کی ادائیگی میں اس وقت محسوس ہوتی ہے جب ہم غیر مسلموں کے سامنے اور غیر مسلم ممالک میں اسلام کے اوصاف ومحاسن کو بیان کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں، تعارف نہیں کرا سکتے۔ اللہ کا پیغام اس کے رسول کی سیرت کو موئثر انداز میں سائنٹیفک طرز سے بتا نہیں سکتے، اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کا جواب مثبت اور تعمیری رویہ سے دیں تو یاد رکھنا ہو گا یہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ جدید تعلیم یافتہ افراد جب اسلام مخالف میڈیائی جنگ سے متاثر نظر آتے ہیں اور ہمارا میڈیا بھی ان کا ہمنوا بن جاتا ہے، شکوک وشبہات کا ایک طوفان برپا ہو تا ہے، طعن وتشنیع کی طغیانی ہوتی ہے اس طغیانی کو بھی اور ان کے شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا بھی دراصل امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

آثار الرجاء (امید)

لغوی معنی

"الاثر ، بقية الشيء" کسی چیز کی باقیات کو کہتے ہیں اس کی جمع آثار [85] یقینی اور حقیقی امید کا ظہور اس کے آثار کے سامنے آنے سے ہی ہے جس سے اس کی اصلیت واضح اور ظاہر ہوتی جاتی ہے کہ ایک اللہ کی رحمت کے امیدوار پر اللہ کی رحمت کس طرح اپنا نقش چھوڑتی ہے جس سے وہ معاشرتی اعتبار سے دوسروں سے متعین اور موکّد ہوتا ہے۔ آثار الرجاء کو دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی ظاہری اور باطنی زندگی امید ولطف سے بھری پڑی ہو تو اس کی دنیاوی زندگی ہی لبریز نظر آتی ہے، کیونکہ ایک مسلمان کی دنیاوی زندگی اخروی اور حقیقی ابدی زندگی کا مقصد یہ ہے تو ہم آثار رجاء کو دنیاوی اعتبار سے اور

اخروی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ امید کی بڑی فضیلت اور بڑا رتبہ ہے اور یہ طالبین کے لیے ایک بڑا مقام اور سالکین کا طریقہ ہے، اگر امید نہ ہو تو دل توخوف سے ٹوٹ جائیں گے۔ ابن القیم کہتے ہیں:"ان منزلة الرجاء منزلة عظيمة جليلة وشريفة وسليمة وعلى الحب والخوف مدار السير إلى الله"[86] امام غزالی کہتے ہیں:"یاد رکھنا چاہیے کہ امید کے بارے میں جاننا خوف سے زیادہ ہے، امید پر عمل کرنا خوف سے اعلیٰ ہے، کیوں کہ بندوں کا اللہ کی طرف قرب اور محبت اس سے ہوتی اور محبت امید پر غالب کرتی ہے اس کو دو طرح سمجھنا چاہیے سزا کا خوف اور ثواب کی امید"[87] اس بات میں ہر کسی کی خیر ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھے باوجویکہ اس نے بڑی خطائیں کی ہوں گی اور وہ واپس اللہ کی طرف رجوع کرنے والا اپنے کیے پر شرمندہ ہو اور شوق اس بات پر ابھارنے والا ہو کہ اللہ غفور رحیم ہے۔

دنیاوی آثار

ایمان کی ترقی اور تقویت امید کو بڑھانے میں بڑا اثر رکھتی ہے یہ ایسی چیز ہے جو ایک شخص کو اللہ کی رضا، مغفرت اور جنت کے دخول کے لیے بڑی اکسیر ہے۔

انشراح صدر ہونا

اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی امید کے مطابق وموافق جود وکرم سے مالا مال کرتا ہے جس سے اسے اطمینان قلب اور شرح صدر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں کو اپنے لطف وکرم سے بھر دیتا ہے جس سے ان کی طبیعت میں وہ طمانیت آتی ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں، جیسا کہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے وہ تین صحابہ کرام جن کا ذکر سورۂ توبہ میں کیا گیا ہے[88]۔ مرارہ بن الربیع، کعب بن مالک، ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جو اپنی سستی کی وجہ سے بغیر کسی عذر شرعی کے تبوک نہ پہنچ سکے، یہ اصحاب دوسرے غزوات میں شریک رہ چکے تھے، مگر اتفاقی طور پر اس لغزش میں مبتلا ہو گئے، منافقین تو اس جہاد میں اپنے نفاق کی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے، واپسی پر ان میں سے ہر ایک نے جھوٹی قسمیں کھا کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کرنا چاہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باطنی حالات کو اللہ کے سپرد کیا اور ظاہری قسموں کو قبول کر لیا، لیکن تینوں نے تخلف کی وجہ سے اپنے دل میں جو ملامت محسوس کی اور صاف صاف اپنے قصور کا اعتراف کر لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کیا[89]۔

ان اصحاب کے دلوں میں یہ حقیقت واضح اور ظاہر تھی کہ اصل بات یقینی طور پر قبول کی جائے گی اور اللہ کی طرف سے ان کی توبہ کو قبول کرنا ان کی دل کی اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کا دل کس طرح اللہ کی رضامندی کا طلب گار تھا کہ انھوں نے کس طرح کی معاشرتی تکلیف کو برداشت کیا لیکن اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئے۔

مایوسی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:"لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّه"[90] "اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو جاؤ" اس آیت کا شانِ نزول بتلاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو کچھ لوگ ایسے تھے جنھوں نے معاصی کا ارتکاب کیا ہوا تھا انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ جس دین کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں وہ تو بہت اچھا ہے لیکن فکر یہ ہے کہ ہم نے بڑے گناہ کیے ہیں اگر مسلمان ہو جائیں تو کیا ہماری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[91]۔ ضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ آیت سب آیات میں سب سے زیادہ امید افزا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے "ان ربك لذو مغفرة للناس على ظلمهم"[92] کی بابت فرمایا سب سے زیادہ رجاء کی آیت ہے۔ "وَاتَّبِعُوا أَحْسَنَ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ"[93] "اور تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس جو بہترین باتیں نازل کی گئی ہیں، ان کی پیروی کرو" "أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَاحَسْرَتَا عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ"[94] "کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی شخص کو یہ کہنا پڑے کہ: "ہائے افسوس میری

اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے معاملے میں برتی!" ان تینوں آیات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑے سے بڑے فاجر کو بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے، اگر وہ توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ سارے گزشتہ گناہ معاف فرمادے گا، حتیٰ کہ کفروشرک کو بھی توبہ سے معاف فرمادیتا ہے اور توبہ کا وقت مرنے سے پہلے پہلے ہے، مرنے کے بعد قیامت کے روز کوئی توبہ کرے یا اپنے کیے پر حسرت کرے گا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔[95]

اسماء الحسنیٰ کی معرفت

انسان پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کی اسے معرفت حاصل ہو اور وہ اس کے معانی کو جاننے والا ہو اور اس کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھے۔"وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا"[96]" اور اسمائے حسنیٰ (اچھے اچھے نام) اللہ ہی کے ہیں۔ لہٰذا اس کو انہی ناموں سے پکارو" اور اللہ کے مختلف اسماء سے اسے پکارے، ان کی خاصیات کو اپنے علم میں رکھتے ہوئے اپنی طلب اور سوال کو اس سے ہی متعلق جانے اور سمجھے، اسماء وہ نام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کمال پر دلالت کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کمال کا سب سے اعلیٰ درجہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے اس کے سوا کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے، تو لہٰذا اس ذات کو ہی پکارنا چاہیے جو حمد وثنا کے لائق ہے، جو حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتی ہے[97]۔ انسان جب اپنی حاجات کو مانگتا ہے تو صرف اس سے مانگتا ہے جو اس کی حاجت پوری کرنے کی طاقت رکھتا ہے تبھی امید بھی بر آتی ہے، اور اگر حاجات کو مانگتا ہے تو اسے امید ہوتی ہے کہ کسی نقصان کا احتمال نہیں ہے تو اللہ کو پکارنا اس کی امید کا نقد آور ہوتا ہے۔

دنیاوی آثار

قرآنِ کریم سے جو اثرات مترشح ہوتے ہیں حسب ذیل ہیں:

1۔ جہاد و مہاجرت پر امید کی بنیاد رکھنا:"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ"[98]"جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، تو وہ بیشک اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"

2- قرأت و تلاوت قرآن کریم امید کا باعث ہے:"إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَذَا"[99]" اور وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے آملنے کی توقع نہیں رکھتے جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں، جبکہ وہ بالکل واضح ہوتی ہیں، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ: یہ نہیں، کوئی اور قرآن لے کر آؤ"

3۔ دنیا میں نیک افراد کی معیت امید قائم رکھتی ہے:"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ"[100]" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو"" قَالُوا يَاصَالِحُ قَدْ كُنْتَ فِينَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هَذَا"[101]" وہ کہنے لگے: اے صالح! اس سے پہلے تو تم ہمارے درمیان اس طرح رہے ہو کہ تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھی"

4- نیک اعمال کے لیے کسی کو وسیلہ بنانا:"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ"[102]" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو امید ہے کہ تمہیں فلاح حاصل ہوگی"

اخروی آثار

قرآنِ کریم سے جو اثرات مترشح ہوتے ہیں حسب ذیل ہیں:

1۔ اخروی ملاقات کی تمنا رکھنا:"اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ"[103]" وہ لوگ ہم سے (آخرت میں) آملنے کی کوئی توقع ہی نہیں رکھتے، اور دنیوی زندگی میں مگن اور اسی پر

مطمئن ہوگئے ہیں،اور جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں""فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ"[104]"لہٰذا جو لوگ ہم سے (آخرت میں) ملنے کی توقع نہیں رکھتے، ہم انہیں اس حال پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں"

2۔عبادت وسجود پر مداومت اخروی امید کی بنیاد ہے:"اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّه"[105]"بھلا (کیا ایسا شخص اس کے برابر ہو سکتا ہے) جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا ہے، کبھی سجدے میں، کبھی قیام میں، آخرت سے ڈرتا ہے، اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہے؟"

3- اسوہ حسنہ اخروی امید کی علامت ہے:"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِر"[106] "مسلمانو) یقیناً تمہارے لیے ان لوگوں کے طرز عمل میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت سے امید رکھتا ہو"

4۔حساب وکتاب کا ہونا:"اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا"[107]"وہ (اپنے اعمال کے) حساب کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے"

خلاصۂ بحث

انسانی زندگی کے وہ ظاہری اعمال جو اس کی کیفیت کو بتلاتے ہیں انھیں "مظاہر" کہتے ہیں۔"امید" کے پہلو کا سب سے بڑا وصف اور مظہر جناب رسول اللہ ﷺ کی اتباع واطاعت سے ہی ہے، لہٰذا اس کا استغراق کہ کوئی فعل ایسا ظہور نہ ہو کہ جو کہ منافی اطاعت واتباع ہو، اور اصل مقصود تو محبت رسول ﷺ ہی ہے، اتباع واطاعت رسول ﷺ تو اپنی مرضی کو صحیح کرنے کا نام ہے، نفس مطمئنہ کا حقیقی مصداق تو وہی ہوتا ہے جو اطاعت واتباع رسول ﷺ سے ہی رجائیت پاتا ہے۔ مصائب وآلام پر شکوہ شکایت چھوڑ دینا صبر کہلاتا ہے اور اسی سے ثواب کی لذت اور حلاوت محسوس ہوتی ہے، مظاہر اور آثار (رجاء) امید کے بیان نے اس راستے کی نشان دہی کر دی کہ جس پر چل کر ایک فرد یا معاشرہ دنیاوی آسودگی، اطمینان کے ساتھ ساتھ اخروی کامیابی ونجات کو حاصل کر سکتا ہے۔ مظاہر وآثار رجاء سے تمام اشیاء کے حقیقی اور معاشرتی تصور کو سمجھنا آسان تبھی ہو گا جب اس کا اطلاق انفرادی اور معاشرتی سطح پر ایک صالح زندگی کو پروان چڑھائے اور یہی حقیقت انسانی زندگی میں دنیا وآخرت کے تعمیلی وتمکینی پہلو کو اجاگر کرتی ہے، جو نیکی کے پھیلاؤ کی ظاہری کیفیات اور طرق کو واضح کرتے ہوئے مؤمن مطلوب کے مقام ومرتبہ کو بیان کرتی ہیں، تاکہ مظاہر امید اور آثار امید زندگی کی اونچ نیچ میں ایک مضبوط سہارا بن سکیں اور زندگی کی تلخیوں اور مایوسیوں سے پیدا ہونے والے تناؤ کو کم کیا جا سکے۔

References

[1] Kh.Abdul Majeed BA, *Jame ul lughat* (Lahore: Urdu science Board, 1989), I:226.

[2] Waris serhindi, *Qamoos Mutradfat* (Lahore: Urdu science Board, 1986), 143.

[3] As above,32.

[4] Molvi Feroz udee, *Feroz ul Lughtat*(Lahore:Feroz Sons,2010),123.

[5] As above, 16.

[6] As above, 39.

[7] As above, 598.

[8] Molvi Syyed Ahmed Dehlwi, *Frangh Asfiya,*(Lahore: Urdu science Board, 1987),1 :228.

[9] Molvi Feroz udee, *Feroz ul Lughtat,*123.

[10]Ibn-e-Manzūr al-Afrīqī, *Lisān al-'Arab,* (Beirut: dar e Sadir, 1414 AH), 1: 82-83.
[11]Raghib Isfahani, *Almufrdat*(Beirut: Dae ul marfha),308.

[12] As above, 190.

[13]Al-Taoba, 9:106

[14] Ibn-e-Manzūr al-Afrīqī, *Lisān al-'Arab* ,14:310.

[15] Abu Hilal Al-askari,*Frooq ul Lughwya*(Qumm:Moassat ul Nashr ul Ialami,1412AH),247.

[16] Ibn-e-Qyim,*Midarj ul Salkin,*(Al-Qahira:Matbet ul Sunnat ul Al Muhmdyya1375AH),2:36.

[17] Shareef Al Jurjani,*Muejm ul Tarifat*(Al-Qahira:Dar ul Fazela),95.

[18] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen*(Beirut: Dae ul marfha),4:142.

[19] Abu Hilal Al-askari,*Frooq ul Lughwy*,247.

[20] Muhammad Fuad Abdul Baqi,*Al-Mujam ul mufhras le alfaz AL Quran Al Kareem*(Al-Qahira:Dar ul Hadees,1364AH),304.

[21] Ibn-e-Manzūr al-Afrīqī, *Lisān al-'Arab ,4:* 520.

[22] Al-Furqan, 25:63-77.

[23] Al-Ahzab, 33:21.

[24] Al-Byyna, 89:7-8.

[25] Abu Abdullah Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari*(Damascus:Dar e Tooq al najat1422AH) 1:12.

[26] Dr. Khalid Alvi, *Insan e Kamil*(Lahore:Al-fisal Nashran2016AD).261-288.

[27] Mullah Ali Qari,*Sharh ain ul ilm wa zyin al hilm,*(Al-Qahira:Idart ul Tbaea ul Munerya)2:375.

[28]Al-Fajar, 89 :27.

[29] Raghib Isfahani, *Almufrdat*(Beirut: Dae ul marfha),474.

[30] Abu Talib Al Makki,*Qwt ul Quloob*(Beirut:Dar ul Fikr),2:450.

[31] Al-Ankaboot, 29:10.

[32] Al-Fajar, 89 :16.

[33] Abu Talib Al Makki,*Qwt ul Quloob,*2:450,

[34] As above *2:450*

[35] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom al Din,*4:97-98.

[36] Al-Sajda, 32:13

[37] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen,*4:106-108.

[38] Al-Taoba, 9:102.

[39] Al-Frahedi, Al- Khaleel bin Ahmed,*Ktab ul Aain,*(Beirute:Dar ul Kutb al Ilmyya), 2:347.

[40] Ibn-e-Qyim,*Midarj ul Salkin*,2:244.

[41] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen,*4:130.

[42] Al-Nakhal, 16:18.

[43] Luqman, 31:31.

[44] Al-Bakra, 2:172.

[45] Muslim bin Al Hjjaj al Qushari,*Saheeh Muslim,*(Dar e Ihya e Al Tturas Al Arbi1374AH) ,4:2095.

[46] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen,*4:142.

[47] Ibraheem, 14:7

[48]Al-Anfal 8:53

[49] Mufti Muhammad Shafee *Maarf ul Quran*(Karachi: Idart ul Maarif ,1400AH), 4:475.

[50] Abu Talib Al Makki,*Qwt ul Quloob2:475*

[51] Ali Hajwari,*Kashf ul Mahjoob[Translation By: Molwi ferooz Ul Deen]*(Lahore: Feroz sons) .173.

[52] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari 4:41.*

[53] Al-Anbya, 21:90.

[54] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen,*4:354.

[55] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen,*4:526-527.

[56] Ibn e Faris Zkrya,*Miqyas ul Lugha,*(Beirut:Dar ul Fikr), 2:358.

[57]Feroz Abadi.Muhammad bin Yaqoob, *Alqamoos Ul Muheet,*(Beirut: Dar e Ihya ut Tras Al Arbi)*1:560.*

[58] Aal e Imran, 3:190-191

[59] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari 8:87*

[60] Abu Abdullah Muhammad bin Abdullah Khatib at Tibrizi, *Mishkat ul Msabeeh* (Lahore: Maktaba Rehmanya), 2:459

[61] Al-Bakra 2:177

[62] Muslim bin Al Hjjaj, *Saheeh Muslim,* 4:2000

[63] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari,* 8:9

[64] Ibn maja, Abu Abdullah,*Sunn e Ibn maja*(Bierut:Dar e Ihya ul Kutob al Arbya) *1:88*

[65] Abu Iesa Muhammad bin Iasa,*Sunn e Tirmazi*(Beirut:Dar ul Gharb al Islami1998AD) *3:86*

[66] Al-Bakra, 2:83.

[67] Al-Bakra, 2:84.

[68] Muslim bin Al Hjjaj, *Saheeh Muslim, 4:1990*

[69] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari,* 2:71; Muslim bin Al Hjjaj al Qushari, *Saheeh Muslim* 4:1704; Abu Iesa Muhammad bin Iasa, *Sunn e Tirmazi,* 4:13.

[70] Dr. Khalid Alvi, *Insan e Kamil*.588.

[71] Al-Bakra, 2:186.

[72] Al-Mumin, 40:60.

[73] Abul Aala Madudi,*Tefheem ul Quran*(Lahore: Idara Terjman ul Quran2015 AD), 4:419

[74] Fatir, 35:15.

[75] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari 8:74;* Muslim bin Al Hjjaj, *Saheeh Muslim,* 4:2063

[76] Al-Hajr, 15:36.

[77] Abu Abdullah,Hakim Naysha puri,*Al-Mustdrik Ala Al* Sahehain(Dar ul Kutob Al Ilmya1411AH),1*:682*

[78] Al-aloosi,Al-syyed Mehmoud,*Rooh ul Meani* (Beruet:Dar e Ihya e altras alerbi),4:28.

[79] Raghib Isfahani, *Almufrdat,*331.

[80] Muhammad Fuad Abdul Baqi,*Al-Mujam ul mufhras le alfaz AL Quran Al Kareem,*76-79.

[81] As above, 458-459.

[82] As above, 718-719.

[83] Al-Ghashya,88:21-22.

[84] Al-Bukhari *,Saheeh Bukhari 4:121;* Muslim bin Al Hjjaj, *Saheeh Muslim,* 4:2290.

[85] Feroz Abadi, *Alqamoos Ul Muheet,*1:489.

[86] Ibn-e-Qyim,*Midarj ul Salkin*,2:41.

[87] Al-Ghazali,*Ihya-e- Ulom Ul Deen*,4:142.

[88] Al-Taoba, 9:117-118.

[89] Mufti Muhammad Shafi ,*Maarf ul Quran,* 6:476.

[90] Al-Zumar, 39:53.

[91] Al-Bukhari,*Saheeh Bukhari,* 6:125.

[92] Al-Rrad, 13:6.

[93] Al-Zumar, 39:55.

[94] Al-Zumar, 39:56.

[95]Mufti Muhammad Shafi, *Maarif ul Quran,* 7:570.

[96] Al-Aaraf 7:180.

[97] Mufti Muhammad, Shafi ,*Maarf ul Quran,* 4:130.

[98] Al-Bakra, 2:218.

[99] Younus, 10:15.

[100] Al-Taoba, 9:119.

[101] Hood, 11:62.

[102] Al-Maida, 5:35.

[103] Younus, 10:7.

[104] Younus, 10:11.

[105] Al-Zumar 39:9

[106] Al-Mumthina 60:6

[107] Al-Naba 78:27